AL-JAMEI Research Journal
ISSN (Print) 3006-4775 (Online) 3006-4783

https://aljamei.com/index.php/ajrj

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں حقیقت پسندی اور افسانوی ارتقاء

Realism and Mythological Evolution in the Stories of Ahmad Nadeem Qasmi

Muhammad Younis Lashari
M.Phil Scholar (Urdu), NCBA&E, Sub Campus, Multan
younislashari85@gmail.com

Nadeem Ahmed
M.Phil Scholar (Urdu), NCBA&E, Sub Campus, Multan drnadeemkhan1431@gmail.com

Dr. Aziz Aslam Durani
Professor, Department of Urdu, NCBA&E, Sub Campus, Multan

Abstract

Ahmad Nadeem Qasmi stands as a distinguished figure in Urdu short fiction, celebrated for his sincere and compassionate portrayal of human realities and social struggles. His work centers on the marginalized—peasants, laborers, and women—depicting their lives with a realism that is deeply rooted in empathy and humanism. Rather than mere descriptions, Qasmi explores the profound inner world of his characters, showing how they maintain dignity, hope, and moral strength in the face of injustice and adversity. Over time, his artistic style evolved from simple, event-driven narratives to mature reflections on human consciousness and inner conflict, significantly expanding the intellectual and emotional scope of the Urdu short story. Ultimately, the beauty of Qasmi's realism lies in its ability to present life in its totality, connecting simple everyday experiences to deep philosophical meanings and compelling readers to recognize the true essence of human existence.

Keywords: *Ahmad Nadeem Qasmi, Realism, Humanism, Social Issues, Empathy, Moral Strength, Human Emotions, Artistic Evolution, Inner Conflict, Social Reality*

افسانہ:

افسانہ اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے جس میں کسی خاص واقعے، کردار یا انسانی تجربے کو محدود پلاٹ اور مختصر پیرایے میں بیان کیا جاتا ہے۔ افسانہ حقیقت اور خیال کے درمیان ایک نازک توازن قائم کرتا ہے جہاں مصنف انسانی زندگی کے جذبات، نفسیاتی کیفیات اور سماجی مسائل کو پیش کرتا ہے۔ اس میں پیش کی گئی کہانی ناول کی طرح تفصیل میں نہیں ہوتی بلکہ ایک مرکزی خیال یا موضوع کے گرد گھومتی ہے۔ افسانے میں کردار، ماحول اور کشمکش ایک وحدت میں پروئے جاتے ہیں کہ قاری محدود الفاظ میں گہری معنویت اور تجربہ حاصل کر سکے۔ اس صنف کا مقصد نہ صرف تفریح فراہم کرنا ہے بلکہ انسان کے جذبات اور فکر کو بیدار کرنا بھی ہے۔

کتاب یا کہانی کی قسم جو خیالی کرداروں اور واقعات کے بارے میں لکھی گئی ہے اور حقیقی لوگوں اور حقائق پر مبنی نہیں ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق:

> "The type of book or story that is written about imaginary characters and events and not based on real people and facts."(۱)

پروفیسر صغیر افراہیم افسانے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> " افسانہ انسانی زندگی کے تعلق سے اس کے تمام محرکات وعوامل گوناگوں مشاغل، سانحی نشیب و فراز اور واقعاتی مدوجزر کو اپنے اندر سموتے ہوئے اس طرح ادبی پیکر میں ڈھلتا ہے کہ زندگی کے کسی ایک پہلو کو منعکس کر کے قاری کے ذہن پر ایک بھرپور تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ یہ انسانی زندگی سے براہ راست متعلق ہونے کے سبب اس کی طرح متحرک اور تغیر آمیز بھی ہے۔ انسانی زندگی میں جیسے جیسے تبدیلیاں آتی ہیں اور جیسا اُس کا مزاج بنتا ہے اُسی پیکر میں افسانہ بھی ڈھلتا رہتا ہے۔"(۲)

وقار عظیم لکھتے ہیں:

> "ادب میں زمانے کے اس نئے مزاج کا بہترین مظہر مختصر افسانہ ہے۔ وہ زمانے کے مزاج کا مظہر بھی ہے اور اس زمانے میں زندگی کے دن گزارنے والے انسان کی جذباتی اور نفسیاتی ضرورتوں اور تقاضوں کی تسکین کا وسیلہ بھی۔ انسان کو اتنی فرصت نہیں کہ وہ تفریح کی ضرورت اور اہمیت کے احساس کے باوجود تفریح کے ایسے مشغلے اختیار کرے جن میں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے یا ایسی چیزوں کا مطالبہ کرے جو اس سے غور و فکر اور توجہ وانہماک کا مطالبہ کرتی ہوں۔ مختصر افسانے نے انسان کی ان مجبوریوں اور پابندیوں میں اسے وہی چیز دی ہے جس کی اسے ضرورت تھی۔" (۳)

حقیقت نگاری کا تعارف:

حقیقت نگاری سے مراد کسی چیز، حالات یا واقعات کو ان کے حقیقی خدوخال کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ حقیقت نگاری کی ابتدا یورپ میں خاص طور پر فرانس سے ہوئی لیکن اس کے باضابطہ آغاز کے بارے میں ماہرین کے درمیان مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ معروف محقق ڈاکٹر شکیل پتافی کی تحقیق کے مطابق حقیقت نگاری کی ابتدا شان فلیوری کی تحریروں سے ہوئی۔ حقیقت نگاری کا مقصد زندگی کی سچائیوں کو بے پردہ دکھانا اور انسانی تجربات، سماجی مسائل اور معاشرتی حقائق کو فنی انداز میں پیش کرنا ہے۔ اس میں کردار اور ماحول کو حقیقت کے مطابق پیش کیا جاتا ہے تاکہ قاری کو زندگی کے حقیقی رنگوں کا ادراک ہو سکے اور وہ محسوس کرے کہ کہانی میں پیش کیے گئے واقعات اور جذبات حقیقی دنیا سے متعلق ہیں۔

آغاز وارتقاء :

اردو افسانے کا آغاز براہِ راست یورپی اثرات سے ہوا، مگر اس کے پس منظر میں مقامی روایاتِ حکایت گوئی، داستان سرائی اور مثالی قصوں کا گہرا اثر بھی کارفرما تھا۔ اگرچہ اردو نثر کی ابتدائی صورتوں میں داستانی عناصر غالب تھے، مگر بیسویں صدی کے اوائل میں افسانہ ایک باقاعدہ صنف کی صورت میں متشکل ہوا۔ داستان کی طوالت، اس کے مافوق الفطرت عناصر اور کرداروں کی غیر فطری حرکات نے رفتہ رفتہ نئے ذوقِ سماعت کے لیے اپنی کشش کھو دی۔ قاری اب حقیقت کی وہ تعبیر چاہتا تھا جو اس کے اپنے گرد و پیش کے حقائق کی صورت گری کرے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اردو افسانہ ایک نئی فکری بنیاد پر ابھرا۔ حامد بیگ رقمطراز ہیں:

> "اردو کے اولین افسانہ نگار راشد الخیری سرسید تحریک کے پروردہ تھے اور مسلم متوسط طبقہ کی معاشرت کے ہر پہلو کے شناسا۔ اس سوسائٹی میں کاظم جیسے دین دار اور پرہیز گار بزرگ بھی تھے اور صالحہ جیسی حیا پرور اور خوددار لڑکیاں بھی۔ راشد الخیری کے دل پر ان دو کرداروں کا نقش انمٹ تھا۔ پھر ان کے دیکھتے دیکھتے ان کی معاصر معاشرت کی فضا مسموم ہو گئی اور راشد الخیری نے اردو کا پہلا افسانہ "نصیر اور خدیجہ" (مطبوعہ: مخزن لاہور دسمبر ۱۹۰۳ء) رقم کیا۔" (۴)

شخصیت:

قاسمی کا خاندان اعوان قبیلے سے تعلق رکھتا تھا، ایک معزز گروہ جس کی جڑیں عرب آباء و اجداد سے ملتی ہیں۔ وہ بہادری اور مضبوط مذہبی اقدار کے لیے جانے جاتے ہیں۔ قاسمی کے لیے خاندانی تاریخ اہم تھی، اور ان کا نام "ندیم" شاعری سے ان کی محبت کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے پردادا کا نام محمد قاسم تھا جس کی وجہ سے قاسمی کو ان کے نام کا حصہ ملا۔ ان کے والد، پیر غلام نبی، ایک مقدس آدمی تھے جنہوں نے انہیں رحمدلی، فطرت سے محبت، اور اخلاقیات کی تعلیم دی۔ ان کی والدہ، غلام بی بی، ایک سادہ اور محنتی خاتون تھیں، جنھوں نے اپنے خاندان کا بہت خیال رکھا۔ قاسمی کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں اور وہ اپنے خاندان میں خاصے پیارے تھے۔ وہ بچپن میں بھی ہوشیار اور خیال رکھنے والا تھا۔ احمد ندیم قاسمی احمد شاہ اعوان کے نام سے ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو پنجاب کے ایک چھوٹے سے خوبصورت گاؤں انگہ میں پیدا ہوئے، جو اس وقت برطانوی ہندوستان کا حصہ تھا۔ گاؤں سبز پہاڑیوں، آبشاروں اور دیہی علاقوں کی سادہ زندگی سے گھرا ہوا ہے۔ ڈاکٹر افشاں ملک لکھتی ہیں:

”آپ کی جائے پیدائش موضع انگہ ضلع خوشاب پنجاب ہے جو اب پاکستان کا حصہ ہے۔ آپ کے والد ماجد کا نام غلام نبی عرف نبی چن تھا جن کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہو گیا تھا جبکہ ان کی والدہ ۱۹۵۶ء تک حیات رہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی تاریخ پیدائش ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء ہے۔“(۵)

احمد ندیم قاسمی کی تعلیم کے حوالے سے صہبا لکھنوی رقمطراز ہیں:

”انگہ کی مسجد میں قرآن مجید کا درس (۲۱ء۔۱۹۲۰ء)، پرائمری کی جماعتیں انگہ کے پرائمری سکول سے پاس کیں (۲۵ء۔۱۹۲۱ء)، گورنمنٹ مڈل اینڈ نارمل سکول کیمبل پور (۲۹ء۔۱۹۲۵ء)، گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج کیمبل پور (اس زمانے میں ہائی کلاسز بھی کالج سے منسلک ہوتی تھیں (۳۰ء۔۱۹۲۹ء)، گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ (۳۱ء۔۱۹۳۰ء)، میٹریکولیشن (۱۹۳۱ء)، صادق ایجرٹن کالج بہاولپور (۳۵ء۔۱۹۳۱ء)، بی۔اے پنجاب یونیورسٹی (۱۹۳۵ء)۔“ (۶)

افسانوں میں حقیقت پسندی:

محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

” قاسمی کی افسانہ نگاری کو اردو ادب میں حقیقت نگاری (Realism) کی ایک نمایاں مثال سمجھا جاتا ہے، جہاں وہ سماجی مسائل کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرتے ہیں، بغیر کسی مصنوعی پن کے۔ ان کی تحریروں میں دیہی ثقافت، محنت کشوں کی جدوجہد اور سماجی ناانصافیوں کی عکاسی نمایاں ہے۔“ (۷)

اس تحقیق کا پس منظر اردو افسانے کی تاریخی ترقی اور حقیقت نگاری کی ادبی روایت سے جڑا ہوا ہے۔ اردو افسانہ نگاری کی بنیاد انیسویں صدی کے آخر میں رکھی گئی جب رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر جیسے ادیبوں نے رومانوی اور تاریخی افسانے لکھے۔ تاہم، ۲۰ویں صدی کے آغاز میں منشی پریم چند نے حقیقت نگاری کو متعارف کرایا، جو دیہی زندگی، غربت اور سماجی ناانصافیوں پر مبنی تھی۔ پریم چند کے افسانوں جیسے "کفن" اور "پوس کی احمد رات" نے اردو افسانے کو ایک نئی جہت دی، جہاں حقیقت کو بغیر کسی آرائش کے پیش کیا گیا۔

محمد خالد علوی لکھتے ہیں:

” تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں اردو افسانہ نگاری نے نئی شکل اختیار کی، اور پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کی تحریک نے سماجی حقیقت نگاری کو فروغ دیا۔ اس تحریک میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی جیسے ادیب شامل تھے، جو معاشرتی مسائل کو اجاگر کرتے تھے۔ قاسمی بھی اس تحریک سے گہرے متاثر ہوئے اور انہیں اکثر "دوسرا پریم چند" کہا گیا کیونکہ انہوں نے دیہی پاکستان کی سماجی حقیقت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔‘‘(۸)

افسانہ ’ ایک عورت تین کہانیاں ‘نور خاتون کی پیدائش سے لے کر بڑھاپے تک، اس کی زندگی کے تین المناک ادوار کو حقیقت نگاری کے اصولوں پر بیان کرتا ہے۔ افسانہ نگار نے بغیر کسی مثالی سازی کے، معاشرتی جبر، غربت اور عورت کی بے بسی کی سچی تصویر کشی کی ہے۔ اس کی پیدائش ہی اس کے والدین پر معاشی بوجھ کی طرح تھی، اور اس کی پرورش ایک ناقابل ذکر شے کے طور پر ہوئی، جو یہ دکھاتا ہے کہ پسماندہ معاشرے میں لڑکیوں کی ذات کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ جوانی میں، نور کی خوبصورتی اس کے لیے وبال بن جاتی ہے، کیونکہ غریبی اسے مردانہ ہوس کا آسان شکار بنا دیتی ہے۔ یہ ایک سخت سماجی حقیقت ہے جس سے بچنا غریب عورت کے لیے محال ہے۔ اس کی شادی کے متعلق والدین کی سرگوشیاں اسے میت اٹھانے کی تیاری لگتی ہیں، جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ لڑکی کی شادی ایک جذباتی تقریب سے زیادہ ایک ذمہ داری سے چھٹکارا پانے کا عمل ہے۔ اس سماجی ناانصافی کے سامنے، جب کوئی راستہ نہیں بچتا تو نور خاتون رب سے فریاد کرتی ہے:

> "الٰہی! تو جو ایک کو لاکھوں دے ڈالتا ہے۔ لاکھوں کو ایک ایک تو عطا کر دیا کر۔ ہم بڑے صابر اور شاکر لوگ ہیں۔ ہم خون کے گھونٹ پی کر بھی جی سکتے ہیں، مگر رگوں میں خون بھی تو ہو۔ ہم مٹی بھی چاٹ کر بھی زندہ رہ سکتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ ہم سانپ نہیں ہیں۔ ہم تو اشرف المخلوق ہیں۔ ہم تو زمین پر تیرے ہی خلیفے ہیں۔" (۹)

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "لارنس آف تھلیبیا" حقیقت نگاری کی بہترین مثال ہے جو جاگیردارانہ نظام کے تحت دبے کچلے طبقے اور وڈیرے کی ظالمانہ ذہنیت کو بے نقاب کرتا ہے۔ افسانہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ وڈیرے کس طرح اپنی شاہی اور بالادستی قائم رکھنے کے لیے غریب اور بے بس لوگوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے ہیں۔ مسکین عرف سکین کی بے دردی سے پٹائی صرف ایک واقعہ نہیں بلکہ صدیوں سے جاری اس نظام کی علامت ہے جہاں غریب کی عزت ونفس کی کوئی قیمت نہیں اور گستاخی کا تصور بھی طاقت کے ہاتھوں میں ہے۔

خدا بخش اپنے دوست کو یوں کہتا ہے:

> "کیا کریں یار۔۔ ان لوگوں سے یہی سلوک کیا جائے تو سیدھے رہتے ہیں۔" (۱۰)

یہ جملہ وڈیروں کے اس خود ساختہ جواز کو پیش کرتا ہے جس کے تحت وہ غریبوں کو ہمیشہ تابع رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ افسانے میں رنگی کا کردار اس غریب طبقے کی معصومیت اور مجبوری کی نمائندگی کرتا ہے جو وڈیرے کی نظر میں ایک شکار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ خدا بخش کا اپنے باز (لارنس آف تھلیبیا) کے مارے جانے پر رنگی کو قاتل ٹھہرانا اور اسے ملامت کرنا دراصل وڈیرے کے مالکیت کے غرور اور غریب پر بے جا غصہ نکالنے کی فطرت کو دکھاتا ہے۔ اس کے لیے ایک جانور کی موت ایک انسان کی عزت و آبرو سے زیادہ اہم ہے۔ قاسمی صاحب نے نہایت سچائی اور بلاواسطہ انداز میں معاشرتی تضادات اور طبقاتی کشمکش کو پیش کیا ہے جہاں طاقت کا غلط استعمال اور ظلم روزمرہ کا معمول ہیں۔ یہ افسانہ ایک آئینہ ہے جو جاگیردارانہ سماج کی تلخ اور ننگی حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "قرض" سماجی حقیقت نگاری کی ایک دل چھو لینے والی مثال ہے جو غریب طبقے کی مشکلات، ان کے احساسِ ذمہ داری اور اندرونی کشمکش کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے معاشرتی تضاد کو بیان کرتی ہے جہاں ایک مقروض اور مجبور شخص اپنی ذاتی بھوک اور ضرورت کے باوجود دوسروں کی مدد کرنے کے لیے تیار رہتا ہے، مگر اولاد کی بھوک اس کے لیے ناقابلِ برداشت کرب بن جاتی ہے۔

کہانی کا مرکزی کردار، رحمان، ایک معمولی دفتر میں کام کرتا ہے۔ وہ ایک روپیہ قرض لے کر گھر پہنچتا ہے، جہاں اس کی بیوی اور بچے اس کے منتظر ہیں۔ یہ ایک روپیہ ان کے لیے زندگی کی واحد امید تھا۔ گھر آتے ہی وہ اپنی بیوی کو یہ رقم دیتا ہے، لیکن ابھی وہ کپڑے بھی تبدیل نہیں کر پاتا کہ دودھ والا قرض کا مطالبہ لے کر دروازے پر آ جاتا ہے۔ مجبوری کے عالم میں، رحمان کو بارہ آنے اسے دینے پڑتے ہیں۔ بقیہ پچیس پیسوں سے وہ دہی خریدنے نکلتا ہے، لیکن گرمیوں کے باعث اکثر دکانوں سے دہی ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ دہی کی تلاش میں، رحمان آگے بڑھتا ہے اور مزدوروں کے ایک احتجاجی جلوس سے ٹکرا جاتا ہے۔ جلوس میں ایک تختے پر لکھی عبارت ہوئی پڑھتا ہے:

"ہمیں اس وقت کا انتظار ہے جب ہمیں کسی سے قرض نہیں لینا پڑے گا" (۱۱)

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "کپاس کا پھول" ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے تناظر میں لکھا گیا ایک ایسا حقیقت پسندانہ شاہکار ہے جو بظاہر ایک چھوٹی سی دیہی کہانی کے ذریعے جنگ کے آفاقی اور انسانی نتائج کو نہایت کربناکی سے پیش کرتا ہے۔ قاسمی، جو خود دیہی زندگی کے نبض شناس اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے، اس افسانے میں مٹی سے محبت، نفسیاتی گہرائی، اور عورت کی مظلومیت کو یکجا کر کے ایک لازوال حقیقت نگاری کی مثال قائم کرتے ہیں۔ افسانے کا بنیادی محور مائی تاجو ہے، ایک بوڑھی، بیوہ اور بے سہارا عورت جس کی زندگی کا واحد سہارا اور امید، اس کا بیٹا حسن دین جنگ کی بھینٹ چڑھ چکا ہے۔

مائی تاجو کا کردار شدید محرومی، تنہائی، اور آرزوئے موت کی نفسیاتی تصویر کشی کرتا ہے۔ اس کی ساری زندگی کی مایوسیوں نے اسے موت کا متمنی بنا دیا ہے اور اب اس کا محبوب مشغلہ اپنے کفن کی تیاری اور اس پر کلمہ شہادت لکھوانا ہے۔ یہ عمل دراصل زندگی کی بے معنیٰ ہو جانے کی علامت ہے اور اس کے مذہبی رجحان کی گہرائی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس کی اسی خالی زندگی میں راحتاں نامی ایک نوجوان لڑکی کا آنا، جسے مصنف "کپاس کا پھول" سے تشبیہ دیتے ہیں، ایک چھوٹی سی امید اور ممتا کا دوبارہ جنم ہے۔

راحتاں اپنی سادگی اور معصومانہ محبت سے مائی تاجو کی شکستہ نفسیات میں ایک نیا تعلق اور زندہ رہنے کا خفیف سا جواز پیدا کر دیتی ہے۔ یہ حقیقت نگاری کا کمال ہے کہ قاسمی نے کسی مصنوعی رومان کا سہارا نہیں لیا، بلکہ خالص انسانی جذبوں کو سامنے لائے ہیں۔ افسانے کا حقیقت پسندانہ اور دردناک موڑ اس وقت آتا ہے جب جنگ کے سائے اس چھوٹے سے گاؤں تک پہنچتے ہیں۔ راحتاں کی معصومیت اور بے بسی جنگی بربریت کا سب سے بڑا نشانہ بنتی ہے۔ بھارتی فوج کے ہاتھوں اس معصوم لڑکی کی عصمت دری کا واقعہ جنگ کی سب سے تلخ اور شرمناک حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے۔ قاسمی نے یہ دکھایا ہے کہ ملکوں کے درمیان طاقت کی جنگیں ہمیشہ عورت کے جسم اور عزت کی صورت میں سب سے بھاری قیمت وصول کرتی ہیں۔ راحتاں، جو کپاس کے پھول کی طرح نرم و نازک تھی، جنگ کے کیڑے کی طرح مسل دی جاتی ہے۔ یہ واقعہ صرف راحتاں کا نہیں، بلکہ ہر جنگ زدہ علاقے کی عورت کی آفاقی تذلیل کا استعارہ ہے۔ اس صدمے کا مائی تاجو پر پڑنے والا اثر افسانے کے اختتام کو نفسیاتی

حقیقت پسندی کی معراج پر لے جاتا ہے۔ راحتاں پر ہونے والا ظلم مائی تاجو کی تمام بچی کھچی زندگی کی آرزو کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ اسے غصے اور بے بسی کی اس کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ وہ سو نہیں پاتی اور پو پھٹے بے ہوشی کی حالت میں گر پڑتی ہے، اس کے سفید بال اپنے ہی خون سے لال ہو جاتے ہیں۔ قاسمی صاحب اس دردناک کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

> "صبح ہولے ہولے رات کے اندھیرے میں گھل رہی تھی اور مسجد میں وارث علی اذان دے رہا تھا۔ مگر اس سب کے درمیان مائی تاجو اپنی کھاٹ کے پاس ڈھیر پڑی تھی۔ اس کی کنپٹی کے پاس اس کے سفید بال اپنے ہی خون سے لال ہو رہے تھے۔ اسے بے ہوش ہونے کی عادت ہو گئی تھی... ایک بار تو کئی چیونٹیاں اسے مُردہ سمجھ کر چڑھ آئی تھیں اور اس کی جھریوں میں بھٹکنے لگی تھیں۔"
> (۱۲)

افسانوں میں حقیقت نگاری کی خصوصیات:

حقیقت نگاری قاسمی کی افسانہ نگاری کا بنیادی عنصر ہے۔ وہ سماجی حقیقت کو اس کی پوری شدت اور سچائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں، بغیر کسی مصنوعی پن یا رومانویت کے۔ ان کے افسانوں میں دیہی زندگی کے مسائل جیسے غربت، جاگیردارانہ نظام، طبقاتی فرق، عورتوں کی حالت زار اور انسانی تذلیل کو دکھایا گیا ہے۔ حقیقت نگاری کی یہ خصوصیات ان کی تحریروں کو ادبی اور سماجی اہمیت دیتی ہیں۔ آیئے ان خصوصیات کو تفصیل سے دیکھیں، جو مختلف ذیلی سیکشنز میں تقسیم کی گئی ہیں تاکہ تجزیہ واضح اور جامع ہو۔

سماجی مسائل کی عکاسی:

قاسمی کے افسانوں میں سماجی مسائل کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ "ماسی گل بانو" ایک غریب عورت کی کہانی ہے، جو معاشرتی ناانصافیوں، غربت اور استحصال کی شکار ہے۔ گل بانو کی زندگی دیہی پاکستان کی کئی عورتوں کی نمائندہ ہے، جو محنت کرتی ہیں لیکن انصاف سے محروم رہتی ہیں۔ قاسمی نے یہاں طبقاتی جبر کو دکھایا ہے، جہاں امیر لوگ غریبوں کو استعمال کرتے ہیں۔ افسانے میں کرداروں کی زبان اور ماحول حقیقی ہے، جو قاری کو محسوس کراتا ہے کہ یہ ایک سچی کہانی ہے۔ افسانے کا آغاز ایک دیہی منظر سے ہوتا ہے، جہاں گل بانو کی روزمرہ کی محنت اور اس کی بے بسی کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ قاسمی نے عورت کی نفسیاتی حالت کو بھی چھوا ہے، جو اس کی تنہائی اور مایوسی کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ افسانہ سماجی ناانصافیوں پر تنقیدی نظر رکھتا ہے اور پروگریسو تحریک کی یاد دلاتا ہے۔ اس ضمن میں افسانہ "ماسی گل بانو" سے درج ذیل اقتباس دیکھئے:

> "کچھ لوگ کہتے تھے کہ گل بانو کے قبضے میں جنات ہیں اور جو گھر اس کے مطالبات پورے نہیں کرتا اس کے خلاف وہ ان جنات کو بڑی بے رحمی سے استعمال کرتی ہے۔ مثلاً برسوں پہلے کی بات ہے وہ ملک نورنگ خان کے ہاں بقر عید کی رقم لینے گئی تو ملک کا بی اے پاس بیٹا عید منانے آیا ہوا تھا۔ اس نے یونہی چھیڑنے کے لئے کہہ دیا کہ دو اڑھائی مہینے کے اندر پہلی عید والے پانچ روپے اڑا

دینا تو بڑی فضول خرچی ہے اور ایسی فضول خرچی تو صرف نئی نئی دلہنوں کو زیب دیتی ہے۔ گل بانو نے یہ سنا تو ملک کے بیٹے کو عجیب عجیب نظروں سے گھورنے لگی۔ سارا گھر جمع ہو گیا اور نوجوان کو ڈانٹنے لگا کہ تم نے ماسی کو کیوں چھیڑا۔ گل بانو کے ہاتھ پر پانچ کی بجائے دس روپے رکھے گئے مگر اس نے دس کا نوٹ آہستہ سے چولھانے کی حد بندی پر رکھ دیا اور چپ چاپ چلی آئی اور پھر ہوا یوں کہ آدھی رات کو یہ نوجوان پلنگ پر سے گر پڑا۔ مگر یوں گرا کہ پہلے یوں ہی لمبا لمبا چھت تک ابھر گیا پھر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ تڑسے زمین پر گرا۔ چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ ساتھ ہی یہ سلسلہ بھی شروع ہو گیا کہ ہر روز ملک نورنگ خان کی جوان بیٹی کی ایک لٹ کٹ کر گود میں آ گرتی۔ راتوں کو چھت پر بھاگتے ہوئے بہت سے قدموں کی ادھر سے ادھر دھب دھب ہوتی رہتی۔"(۱۳)

دیہی زندگی اور کردار نگاری:

قاسمی دیہی زندگی کی پیشکش کے ماہر فنکار ہیں۔ ان کے افسانوں میں دیہی ماحول کی عکاسی اتنی حقیقت پسندانہ اور جاندار ہے کہ قاری خود کو گاؤں کی گلیوں، کھیتوں اور دیہی زندگی کے روزمرہ مناظر میں محسوس کرتا ہے۔ افسانہ "گنڈاسا" میں دیہی رقابت، انتقام اور خاندانی دشمنی کو نہایت باریکی سے پیش کیا گیا ہے، جو بعد میں مشہور فلم "مولا جٹ" کی بنیاد بھی بنی۔ کردار مولا جٹ اور نورانٹ حقیقی دیہی لوگوں کی طرح ہیں، جن کی زندگی انتقام اور مقامی رسم و رواج کی گرفت میں گھری ہوئی ہے۔ قاسمی نے دیہی زندگی کی سادہ مگر پیچیدہ انسانی عادات اور جذبات کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری کو نہ صرف ماحول کا ادراک ہوتا ہے بلکہ انسانی نفسیات اور معاشرتی تعلقات کی باریکیوں سے بھی روشناس کرایا جاتا ہے۔ ان کے افسانے دیہی سماج کی تلخ حقیقتوں اور جذباتی کشمکش کو بھی بے باکی سے اجاگر کرتے ہیں۔ "گنڈاسا" سے ایک اقتباس دیکھئے:

" سارے گاؤں کو معلوم تھا کہ رنگے کا قاتل مولا ہی ہے، مگر مولا کے چند عزیزوں اور تاجے کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ پھر ایک دن گاؤں میں یہ خبر گشت لگانے لگی کہ مولا کا باپ تو رنگے کے بڑے بیٹے قادر کے گنڈاسے سے مرا تھا رنگا تو صرف ہشکار رہا تھا بیٹوں کو۔ رات کو چوپالوں اور گھروں میں یہ موضوع چلتا رہا اور صبح کو پتہ چلا کہ قادر اپنے کوٹھے کی چھت پر مردہ پایا گیا ہے، اور وہ بھی یوں کہ جب اس کے بھائیوں پچھلے اور گلے نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو اس کا سر لڑھک کر نیچے گرا اور پرنالے تک لڑھکتا چلا گیا۔ رپٹ لکھوائی گئی پولیس آئی، مولا پھر گرفتار ہو گیا۔ مرچوں کا دھواں پیا، تپتی دوپہروں میں لوہے کی چادر پر کھڑا رہا، کتنی راتیں اسے اونگھنے تک نہ دیا گیا۔ مگر وہ اقبالی نہ ہوا اور آخر مہینوں کے بعد رہا ہو کر گاؤں میں آنکلا اور جب اپنے آنگن میں قدم رکھا تو اس کی ماں بھاگی ہوئی آئی، اس کے ماتھے پر ایک طویل بوسہ دیا اور بولی "

ابھی دو اور باقی ہیں میرے لال۔ رنگنے کا کوئی نام لیوانہ رہے تو جبھی بتیس دھاریں بخشوں گی۔
میرے دودھ میں تیرے باپ کا خون تھا مولے اور تیرے خون میں میرا دودھ ہے اور تیرے
گنڈاسے پر میں نے زنگ نہیں چڑھنے دیا۔" (۱۴)

پروگریسو تحریک کے اثرات:

قاسمی کی حقیقت نگاری پروگریسو تحریک سے متاثر ہے، جو ۱۹۳۶ء میں شروع ہوئی اور احمد علی، سعادت حسن منٹو اور دیگر ادیبوں نے اسے آگے بڑھایا۔ یہ تحریک سماجی تبدیلی پر زور دیتی تھی اور قاسمی نے اس سے متاثر ہو کر طبقاتی جبر کی تنقید کی۔ تنقیدی جائزہ میں محمد حسن عسکری نے ان کی نفسیاتی گہرائی کی تعریف کی، جبکہ وارث علوی نے انہیں دیہی حقیقت نگار قرار دیا۔ پریم چند سے موازنہ کریں تو قاسمی نے اس روایت کو پاکستان میں جاری رکھا۔

ڈاکٹر افشاں ملک کے مطابق:

" احمد ندیم قاسمی ایک اور معنی میں اپنے ہم عصروں میں امتیاز کا درجہ رکھتے ہیں اور وہ یہ کہ جب
ترقی پسند مارکسی یا اشتراکی نظریہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر پروپیگنڈائی ادب کی تخلیق کر رہے تھے۔
انھوں نے اس وقت بھی اس اشتہاری ادب کی تخلیق سے گریز کیا اور ترقی پسند تحریک کے وہ
رجحانات اپنائے جو معاشرے میں قابل قبول تھے اور دینی اور اخلاقی قدروں کا احترام سکھاتے
تھے۔ علاوہ ازیں، مقصدیت کے پہلو پر زور دیتے ہوئے بھی افسانے کے فن کو مجروح نہیں ہونے
دیا۔"(۱۵)

احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری اردو ادب میں حقیقت نگاری کی ایک روشن مثال ہے، جو سماجی مسائل کو فنی کمال کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اس تحقیق کا پس منظر پروگریسو ادبی تحریک اور دیہی حقیقت نگاری کی روایت سے جڑا ہے جو قاسمی کو ایک اہم مقام دیتا ہے۔ ان کی تحریریں نہ صرف ادبی بلکہ سماجی تبدیلی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی نے اردو افسانے کو محض داستان یا تمثیل سے نکال کر حقیقی زندگی کے مسائل سے جوڑا۔ ان کی افسانہ نگاری نے اردو ادب میں حقیقت نگاری کی اس روایت کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اسے پاکستانی معاشرتی و ثقافتی تناظر میں ازسرِ نو متشکل کیا۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ محض ایک کہانی گو نہیں بلکہ ایک سماجی فلسفی بھی ہیں، جو اپنے کرداروں کے ذریعے معاشرتی ناہمواریوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ قاسمی کے افسانوں میں وہی کرب، دکھ، جدوجہد اور مزدور طبقے کی خاموش چیخ سنائی دیتی ہے جو ہمیں پریم چند یا کرشن چندر کے افسانوں میں ملتی ہے، مگر فرق یہ ہے کہ قاسمی نے پاکستانی دیہی معاشرت کو موضوع بنایا۔

قاسمی کی حقیقت نگاری کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے نظریاتی پس منظر کو دیکھیں۔ ترقی پسند تحریک (Progressive Writers' Movement) کا آغاز ۱۹۳۶ء میں لندن میں ہوا جب چند انقلابی مزاج ادیبوں نے ادب کو محض

جمالیاتی تجربہ سمجھنے کے بجائے سماجی تبدیلی کا آلہ قرار دیا۔ فیض احمد فیض، احمد علی، منٹو، کرشن چندر اور عصمت چغتائی اس تحریک کے اہم نام تھے۔ احمد ندیم قاسمی اسی فکری روایت کے نمائندہ ادیب ہیں جنھوں نے اپنے فن کو معاشرتی انصاف کے فروغ کے لیے استعمال کیا۔ ان کے نزدیک ادب کا مقصد محض تفریح نہیں بلکہ انسانی شعور کی بیداری ہے

بین الاقوامی تناظر میں:

قاسمی کی حقیقت نگاری کو عالمی حقیقت نگاری کے تناظر میں دیکھا جائے تو ان کے افسانوں میں بالزاک کی سماجی حقیقت، چیکوف کی نفسیاتی گہرائی، اور فلوبرٹ کی فنی سادگی کا امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ قاسمی کی فکری ساخت میں روسی حقیقت نگاروں جیسے ٹالسٹائی اور دوستوفسکی کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ ان کا فن زندگی کے تضادات کو ظاہر کرتا ہے، مگر اس میں ایک انسانی امید بھی موجود ہے—یہی امید قاسمی کو ایک مارکسی حقیقت نگار سے بڑھا کر ایک انسان دوست فنکار بنا دیتی ہے۔

شہلا شکور اپنے مضمون" احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری"میں لکھتی ہیں:

> " ندیم نے اپنے افسانوں کی اساس گاؤں کے پس منظر میں انسانی زندگی کے اُن المیوں کو اجاگر کرنے پر رکھی جن کا تعلق جذباتی نا آسودگیوں سے کم اور معاشی عدم مساوات سے زیادہ ہے۔ (۱۶)"

افسانوی جائزہ:

احمد ندیم قاسمی نے اپنی ادبی زندگی میں تقریباً ۵۰۰ سے زائد افسانے لکھے جو مختلف مجموعوں میں شائع ہوئے۔ ان کے اہم مجموعے شامل ہیں: چوپال، سیاہ حاشیہ، کپاس کا پھول، گنڈاسا، بازگشت، سلسلہ روز و شب، اس بستی کے ایک کوچے میں، دشتِ وفا، آس پاس اور دیگر۔ یہ مجموعے ان کی افسانہ نگاری کی مختلف جہتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ جہاں دیہی زندگی، سماجی مسائل اور انسانی نفسیات مرکزی موضوعات ہیں۔ قاسمی کی افسانہ نگاری کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عام لوگوں کی زندگیوں کو موضوع بناتے ہیں – محنتی کسان، غریب مزدور، مظلوم عورتیں اور دیہی معاشرے کے پسماندہ طبقات۔ ان کی کہانیاں نہ صرف تفریح فراہم کرتی ہیں بلکہ سماجی شعور بھی بیدار کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر، چوپال میں دیہی چوپال کی گفتگوؤں کو بنیاد بنا کر سماجی مسائل پیش کیے گئے ہیں جو قاسمی کے دیہی پس منظر کی عکاسی کرتے ہیں۔

قاسمی کی ادبی طرز سادہ، بے تکلف اور حقیقت پسندانہ ہے۔ وہ دیہی بولی، مقامی محاورے اور روزمرہ کی زبان استعمال کرتے ہیں، جو قاری کو کہانی میں مکمل طور پر گھلا دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مارکسی تناظر پایا جاتا ہے، جہاں طبقاتی تضاد، معاشی جبر اور سماجی ناانصافیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر، ان کے افسانوں میں جاگیرداروں کا استحصال، غریبوں کی بے بسی اور عورتوں کی حالت زار کو پیش کیا جاتا ہے۔ قاسمی نے اپنے افسانوں میں انسانی نفسیات کی گہری سمجھ دکھائی ہے، جہاں کرداروں کی اندرونی جدوجہد اور خارجی حالات کا امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ امتزاج ان کی افسانہ نگاری کو منفرد بناتا ہے۔ قاسمی کی افسانہ نگاری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ پہلا دور (۱۹۴۰ء-۱۹۳۰ء): ابتدائی دور جہاں رومانوی اثرات غالب تھے، لیکن حقیقت نگاری کی جھلک نظر آتی ہے۔

۲۔ دوسرا دور (۱۹۶۰ء۔ ۱۹۴۰ء)): پروگریسو تحریک کا دور، جہاں سماجی مسائل مرکزی تھے۔

۳۔ تیسرا دور (۲۰۰۶ء۔ ۱۹۶۰ء)): پختگی کا دور، جہاں نفسیاتی گہرائی اور فلسفیانہ عناصر شامل ہوئے۔

ان کے افسانوں نے اردو ادب پر گہرا اثر چھوڑا اور کئی فلمیں جیسے مولا جٹ (جو گنڈاسا پر مبنی ہے) ان سے متاثر ہیں۔ قاسمی کی فنکاری یہ ہے کہ وہ حقیقت کو مثالی (Idealism) سے ملا کر پیش کرتے ہیں جو قاری کو امید اور تبدیلی کی طرف راغب کرتی ہے۔ ان کی کہانیاں مختصر لیکن اثر انگیز ہیں، جہاں مکالمے طبعی اور کردار حقیقی لگتے ہیں۔ ناقدین نے ان کی افسانہ نگاری کو "دیہی حقیقت نگاری" کا نام دیا ہے، جو پریم چند کی روایت کا تسلسل ہے۔

محمد خالد علوی لکھتے ہیں:

> ”قاسمی کی افسانہ نگاری کے موضوعات میں تنوع ہے۔ مثال کے طور پر، سیاہ حاشیہ میں تقسیم ہند کے سانحات کو پیش کیا گیا ہے جو حقیقت نگاری کی ایک مختلف جہت ہے۔ بازگشت میں انسانی روابط اور نفسیاتی مسائل کو چھوا گیا ہے۔ اس بستی کے ایک کوچے میں شہری معاشرے کی پیچیدگیوں کو دکھاتا ہے، جبکہ دشتِ وفا میں دیہی زندگی کی گہرائی ہے۔ قاسمی کی طرزِ تحریر میں سادگی کے ساتھ گہرائی ہے، جو قاری کو متاثر کرتی ہے۔ ان کی افسانہ نگاری پروگریسو ادب کا حصہ ہے، جو سماجی تبدیلی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔“(۱۷)

ناقدین کا کہنا ہے کہ قاسمی نے دیہی زندگی کو اس قدر حقیقت سے پیش کیا کہ یہ اردو ادب میں ایک معیار بن گئی۔ اس جائزے سے واضح ہے کہ قاسمی کی افسانہ نگاری اردو ادب کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔

مزید تفصیل سے دیکھیں تو قاسمی نے اپنے افسانوں میں نہ صرف دیہی بلکہ شہری مسائل بھی پیش کیے ہیں۔ مثال کے طور پر، اس بستی کے ایک کوچے میں میں شہری زندگی کے تنازعات، خاندانی مسائل اور معاشی دباؤ کو دکھایا گیا ہے۔ یہ مجموعہ قاسمی کی وسعتِ نگاہ کو ظاہر کرتا ہے، جہاں وہ دیہی اور شہری دونوں معاشروں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان کی کردار نگاری کی مہارت بھی قابلِ ذکر ہے، جہاں کردار زندہ اور حقیقی لگتے ہیں۔ قاسمی کے افسانوں میں مکالمے دیہی بولی اور مقامی محاوروں سے بھرپور ہوتے ہیں، جو کہانی کو مستند بناتے ہیں۔ یہ جائزہ قاسمی کی افسانہ نگاری کی اہمیت کو واضح کرتا ہے اور آگے حقیقت نگاری کی تفصیلات کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔

حوالہ جات

1. https://www.oxfordlearnersdictionaries.com/definition/american_ english/fiction

۲۔ صغیر افراہیم، پروفیسر، اردو افسانہ: تعریف، تاریخ اور تنقید، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۸ء، ص ۱۵

۳۔ وقار عظیم، فن افسانہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء، ص۱۴، ۱۳

۴۔ حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر ، اردو افسانے کی روایت، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۳۴

۵۔ افشاں ملک، ڈاکٹر، افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی: آثار و افکار ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، جنوری ۲۰۰۷ء، ص۲۲

۶۔ صہبا لکھنوی، احمد ندیم قاسمی (زندگی، شخصیت اور فن کا مستند جائزہ)، مشمولہ: افکار (ندیم نمبر)، شمارہ ۵۸،۵۹، جلد ۳۰،

۷۔ محمد حسن عسکری، ادب اور تنقید ، مکتبہ دانش، کراچی، ۱۹۵۸ء ، ص ۴۵

۸۔ محمد خالد علوی، فکری افسانے، دانش پبلشرز، لاہور ، ۱۹۷۶ء، ص ۲۳

۹۔ احمد ندیم قاسمی، نیلا پتھر، ص۱۰۰

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول ص۲۱۱

۱۱۔ ایضاً، ص۲۲۷

۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول ص۱۴۷

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۱۲۶

۱۴۔ احمد ندیم قاسمی، خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص۳۷۰

۱۵۔ افشاں ملک، ڈاکٹر، افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی: آثار و افکار، ص۲۵۸

۱۶۔ شہلا شکور، احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری، مشمولہ: عالمی اردو ادب (احمد ندیم قاسمی نمبر)، شمارہ ۰۰۰، جلد۱۴، کرشن نگر، دہلی، ۱۹۹۶ء، ص۱۱۶

۱۷۔ محمد خالد علوی، فکری افسانے، ص۵۶